'ناشنیدہ' کی پہلی قرأت

کلیدی الفاظ: غزل# کلاسیکی غزل# معاصر غزل# شعری تجربہ# ذاتی شعور# رومانی دردمندی# شعری روایت# روایتی شاعری#

ڈاکٹر احمد امتیاز
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

تلخیص: 'ناشنیدہ' احمد سوز کا شعری مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف تجربات پیش کیے ہیں۔ احمد سوز ایک بزرگ شاعر ہیں جنہوں نے پچاس برسوں سے زیادہ عرصہ شاعری کو دیے ہیں۔ ان کے شعری سفر میں روایت کی پاسداری ملتی ہے، معاصر شعری رویے کی چمک اور جدید ذہن کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ان کے شعری تجربے دل و دماغ دونوں کو منور کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں خیالات کا معصومانہ پن بھی ہے اور جذبات کا سچا اظہار بھی۔ الفاظ کا دروبست بھی ہے اور معنی کا سلجھا ہوا انداز بھی۔ وہ پرانی شعری روایت سے قریب بھی ہیں اور موجودہ دور کے اسلوب و انداز سے منسلک بھی۔

احمد سوز اردو کے معتبر معاصر شعراء کی صف میں شامل ہیں جن کے یہاں شاعری کا اپنا ایک مزاج اور اپنا ایک اسلوب ہے۔ 'ناشنیدہ' احمد سوز کا شعری مجموعہ ہے جس میں اُن کے فکر و خیال کی دنیا آباد ہے۔ ان کی غزلیں صاف ستھری، غیر مبہم اور بامعنی ہیں۔ پہلی قرأت میں ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُن کی شاعری نا آسودہ روح اور متجسس ذہن کی شاعری ہے۔ چھوٹی بحروں میں بڑی خوبی کے ساتھ انہوں نے اپنے خیالات پروئے ہیں۔ انہوں نے اپنی داخلی زندگی کے ساتھ خارجی دنیا کے معاملات کو بھی ہم آہنگ کیا ہے۔ ایسا کرنے سے جہاں موضوعات میں تنوع پیدا ہو گیا ہے وہیں اسلوب میں جدت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ 'ناشنیدہ' میں شامل تمام غزلوں میں اُن کی اپنی ذات چمکتی ہوئی نظر آتی ہے اور اُن کی ذات سے منسلک وہ لوگ بھی چمکتے ہیں جو اُن کی یادوں کے بسیرے میں ڈیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس شعری سفر میں اُن زخموں اور تلخ و شیریں تجربات کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اس سفر میں اُن کی ذات سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کے

اس شعری مجموعہ کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ایک مسلسل جستجو ہے جو ان کے شعری سفر میں کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ خواب دیکھتے ہیں، اس کی تعبیر بھی تلاش کرتے ہیں اور اس تعبیر میں زندگی کی ان حقیقتوں کو بھی تلاش کرتے ہیں جن سے اُن کی زندگی نا آسودہ رہ گئی ہے۔ احمد سوز اپنے شعری سفر میں جس قسم کی آرزوؤں سے آراستہ ہیں وہی اِن کی فکر کو جوان بھی رکھتی ہے اور ان کے زخمی روح کو نغمہ زن بھی کرتی ہے۔

میں ہوں کاغذ، مروڑ دے مجھ کو
اپنے اندر سکوڑ دے مجھ کو
جی رہا ہوں مجسمے کی طرح
گونج مجھ میں ، جھنجھوڑ دے مجھ کو
مری دیوانگی کچھ کم کرو نا
محبت پڑھ کے مجھ پر دم کرو نا
تمہارا لمس ہی میری شفا ہے
میں زخمی ہوں، ذرا مرہم کرو نا
دشتِ بدن میں غوغاں سا کچھ
مچل رہا ہے طوفاں سا کچھ
میں نے تحریر کو ڈرتے دیکھا
خوف کاغذ سے ابھرتے دیکھا
منجمد ہو گئے جذبے سارے
آرزوؤں کو ٹھٹھرتے دیکھا
وفا،خلوص ، پیار،سب گئے دنوں کی بات ہے
نہ ذکر کیجئے پیار کا، نہ بات کیجئے یار کی
تماشا اپنے دکھوں کا نہیں پسند مجھے
نمی سی آنکھوں میں،شائستگی کے آنسو ہیں
مرے بھیتر بھی اک آتش فشاں ہے
بدن میں اپنے لُو ہونے لگا ہوں

احمد سوز کی غزلوں کو پڑھ کر یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دنیا اگر چہ بہت عریض و بسیط ہے اور اس عظیم تماشہ گاہ میں انسان کا وجود محض کاغذی پتنگ کی طرح ہے اور بحیثیت انسان کے ہم اپنے پرَ وں کو سمیٹے ہوئے ہَوا کے دوش پر کبھی اِدھر کبھی اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں تاہم زندگی کی اس حقیقت کو احمد سوز بخوبی سمجھتے ہیں۔ وہ نہ خود اور نہ ہی کسی

دوسرے کو کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا کرتے ہیں۔ وہ زندگی سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں مگر اسی حد تک کہ جب تک زندگی انہیں راس آتی ہے اور نہ اس سے اس قدر مایوس ہو تے ہیں کہ زندگی سے توبہ کرلیں۔ وہ ایک عام انسان کی طرح ہی زندگی سے رشتہ استوار کر تے ہیں اور شعوری سطح پر اس کے نشیب و فراز کو قبول بھی کرتے ہیں۔

احمد سوز پرانی نسل مگر نئے ذہن کے شاعر ہیں۔ وہ اس لیے کہ ان کی غزلوں میں جدید ذہن تشکیل پاتا ہے۔ موضوع اور اسالیب دونوں اعتبار سے انہوں نے جدید ذہن پا یا ہے اور اسی رنگ میں ان کی شاعری پروان بھی چڑھی ہے۔ بہت پہلے میں نے عادل منصوری کے کچھ اشعار پڑھے تھے جو اُن کی ابتدائی زندگی کے شعری تجربے تھے:

الف سیر کرنے گیا نو ن میں
ملے میم کے نقشِ پا نون میں
وہ نقطہ جو تھا بے کے نیچے ابھی
سرکتا ہوا آگیا نون میں

ایسا ہی تجربہ ہمیں احمد سوز کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے:۔

میم کیا ہے، نون کیا ہے
لفظ بے مضمون کیا ہے
میں نہ جانوں دن ،مہینے
کیا مئی ہے، جون کیا ہے

اس قسم کے دیگر تجربے بھی ان کے یہاں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کی مختصر ترین بحروں کی غزلوں کو دیکھا جا سکتا ہے جس کا لطف ایک الگ قسم کا مزہ دیتا ہے:۔

مرا پنجہ مروڑا
مجھے پستی میں چھوڑا
نگاہیں اس نے پھیریں
چلا دل پر ہتھوڑا
زندگی ہے خودداری
یار! جی حضوری کیوں
مجبوری ہے اجل مجھے
آ! مٹی، آ! نگل مجھے

آدمی کی ذات کیا
خاک کی بساط کیا
زندگی کی اصل میں
موت ہے زکوٰۃ کیا

مذکورہ اشعار میں لسانی تجربے کی رمق بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ اشعار فکر و خیال کے اعتبار سے بھی متاثر کرنے والے ہیں اور لسانی تجربے کے اعتبار سے بھی۔ اس قسم کے اظہار میں وہ خیالات بھی تقویت پاتے ہیں جو بعض حالات کی جبر میں دبے رہ گئے تھے۔ ایسے میں اکثر انسان بے بس اور تنہا ہی محسوس کرتا ہے۔ احمد سوز ایسے تمام تجربوں کو زبان دیتے ہیں جو خود اُن کی ذات کا حصّہ ہیں۔ ان تجربوں کی پیش کش میں وہ محض زبانی برتاؤ پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ خود اُن کا ذاتی شعور بھی اس میں حصّہ لیتا ہے، جس سے وجود کی آگہی کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں ایک قسم کی رومانی دردمندی کے احساس کو بھی جگانے کی کوشش کی ہے جو اُن کے نفسیاتی رجحان کا پتا دیتی ہے اور شعری بصیرت کے اُس لطف کو بھی بڑھاتی ہے جو شاعری کا اصل مقصد ہے۔

احمد سوز کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ ان کے حافظے کی تہہ کدوں میں رشتوں کے جو آثار رہ گئے تھے انہیں وہ کبھی بھلانا یا جھٹلانا گوارا نہیں کرتے ۔ زندگی سے جو اور جیسی شکایتیں انہیں تھیں اس کا برملہ اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں کیا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہی حق گوئی اور بے باکی ان کے رشتوں کی تہذیب کا اصل جوہر ہے۔ جس سلیقے سے انہوں نے اپنی یادوں کے بسیروں کو آباد کیا ہے اور جس تغیر و تبدّل سے اپنے دل و دماغ کو آشنا کیا ہے، وہ کم کم ہی دوسرے شعراء کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں قلبی واردات بھی رقم ہوئے ہیں، شکایات بھی مرقوم ہیں اور جنون کی حکایات بھی منظوم ہیں، لیکن ضبطِ تہذیب سے وہ کبھی منھ نہیں موڑتے۔ ان کی دیوانگی میں ایسی فرزانگی بھی تہہ نشین ہے جو اُن کے کلام کو ایک نئے ذائقہ سے قریب کر دیتی ہے۔ احمد سوز نے اگر کہیں شکایت کا لہجہ بلند بھی کیا ہے یا پیار کے دو بول بھی بولیں ہیں یا کہیں مایوسی کا اظہار بھی کیا ہے، تو بھی تہذیب کی متانت کا خوب خیال رکھا ہے اور یہی چیز زندگی سے اُن کے گہرے رشتے کا پتا بھی دیتی ہے۔ ان کی سرشاری میں ایک قسم کی بے ساختگی ہے جو دیدنی بھی ہے، پر لطف بھی اور بے لوث بھی۔

روشنی بڑھ رہی ہے آنکھوں کی
پڑھ رہا ہوں کتاب چہروں کی

دستکیں تم بھی نہ دینا در پر
آج جی بھر مجھے سونے دینا
میرے جینے کا بہانہ ہو جا
آ! مرے ساتھ پرانا ہو جا
کتنے قصّے، کتنی یادیں
مجھ میں کتنے تہہ خانے تھے
کوئی نہیں تھا بھیتر لیکن
دروازے ہی دروازے تھے
جشن نفرت کا منایا جائے گا
شہر پاگل ہو گیا ہے آج پھر
اک بڑے خواب کے کردار ہیں کیا
ہم کسی آنکھ میں بیدار ہیں کیا
میرے کمرے میں روز آئے دھوپ
گدگدا کر مجھے جگائے دھوپ
مسکرانے سے پھول کھلتے ہیں
اپنے چہرے کو پھول کر کے دیکھ
صدائے درد سے لرزے ہے شب کا سناٹا
لہولہان یہاں ہے کوئی دوانہ کیا
کیڑے مکوڑوں، پھولوں، پھلوں، پیڑوں کی طرح
آتے ہیں اور جاتے ہیں بس، اور کیا ہیں ہم

احمد سوز اردو غزل کی کلاسیکی روایات سے آگاہ نظر آتے ہیں اور جدید روایات سے بھی مانوس ہیں۔ روایت سے وابستہ ہونا ایک الگ چیز ہے اور روایتی ہونا دوسری چیز۔ روایتی شاعری سے ہماری مراد حالی سے قبل کی اس شاعری سے ہے جو سراسر مشرقی نظامِ بلاغت کی بنیاد پر تھی لیکن اُس کی بھی دو مثالیں تھیں۔ ایک وہ جس پر محض الفاظ کی حکمرانی تھی۔ دوسری وہ جس میں لفظ ایک تجربے کے طور پر وارد ہوتا ہے۔ اِس قسم کی شاعری میں روایت محض روایت کے طور پر برقرار نہیں رہتی بلکہ اسے تھوڑا بہت شکست و ریخت سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ روایت کی بحث کو سب سے پہلے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اٹھائی تھی کہ روایت کیا ہے؟ اور اس نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ یورپ کا کوئی بھی شاعر مغربی شعری روایت سے اپنے آپ کو منقطع کر کے اچھی شاعری یا بری شاعری نہیں کر

سکتا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس خیال کا اطلاق اگر ہم اردو شاعری پر کریں تو انیسویں صدی ربعِ آخر سے بیسویں صدی نصف تک کی شاعری کو ایک الگ نام دینا پڑے گا کیوں کہ اُس دور کی شاعری بیشتر صورت میں روایتی ہی تھی اور موجودہ عہد کی شاعری کو ایک الگ زمرے میں رکھنا پڑے گا کیوں کہ اس دور کی شاعری اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ شاعری میں محض لفظ کا استعمال کوئی معنی نہیں رکھتا، ذات اور تجربے کا عکس بھی ضروری ہوتا ہے۔ Feelings اور Sufferings یعنی احساسات اور اضطراب یا بے چینی، جس کے تجربے سے موجودہ عہد کے شعراء کی ذات گزری ہے، اُس کا رنگ و عکس بھی اُن کی شاعری کو ایک الگ معیار بخش دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر عہد میں روایتی شعراء ہی زیادہ ہوتے ہیں اور اُن شعراء کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے جن کے یہاں اپنی انفرادیت کا عکس پایا جاتا ہے۔

روایتی شاعری سے ہماری مراد ہمارے ماضی کا وہ سرمایہ ہے جس سے ہماری تاریخ ثروت مند ہوئی ہے۔ ہر دور کی شاعری نے آنے والے زمانے کی شاعری پر اپنے گہرے اثرات قائم کیے ہیں۔ قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی تاریخ ایک بڑے بے یقینی کے دور سے گزری ہے۔ انسانیت کو کئی طرح کی ڈراونی حقیقتوں کا سامنا رہا ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ تک التباسات کے سارے پردے چاک ہوتے رہے ہیں۔ سارے خواب چکنا چور ہوئے ہیں۔ انسان کا ہر عقیدے سے ایقان اٹھا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے دور کے شعراء نے اپنے فریب شکن جذبوں، مایوسیوں اور اضمحلال کا اظہار بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پُر امیدی اور رجائیت کا اظہار، ترقی پسند شعراء نے غالب کے اسلوب میں کرنے کی کوشش کی تھی۔

نئے تجربے اور جدّت کے لیے روایت پر قدرت ضروری ہے۔ اگر کوئی شاعر لفظوں سے کھیلنے کے بجائے اسے نئے معنی و مفاہیم میں برتنے کا سلیقہ جانتا ہے تو پرانے لفظیات محض روایتی نہیں رہ جاتے بلکہ اُن میں نئی شان پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کی اہمیت یا معنویت ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ سہی ہے کہ موجودہ اردو شاعری کو ہم روایتی شاعری کا نام نہیں دے سکتے مگر اس کے باوجود اِس نے ماضی سے جس طرح رشتہ استوار رکھّا ہے اور ہندوستانی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کو پیش کیا ہے، وہ اپنی معنویت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ معاصر شعراء کے یہاں جہاں ایک طرف اپنے عہد کی صورتِ حال کے مخصوص منظر نامے کو اپنے وجود کا حصّہ بنانے کی کوشش نظر آتی ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے صدیوں کی تہذیبی، فکری اور جذباتی و احساساتی صورتِ حال کی گونج کو بھی اپنے حقیقی

مشاہدے کا حصّہ بنایا ہے۔ ظفر اقبال، محمد علوی، زیب غوری، عادل منصوری، باقر مہدی، شہر یار، بانی، احمد سوز، عتیق اللہ وغیرہ تک اور اِن کے بعد کی نسلوں تک کے یہاں تشبیہات و استعارات، تلازمات و اشارات کا وہی روایتی منظر نامہ نظر آتا ہے جو نئے مفاہیم و مطالب کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

روایت کبھی مرتی نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا سرچشمۂ حیات ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ تمام طرح کے نئے شعری تجربوں کے باوجود اردو شاعری کی اعلیٰ ترین روایات آج بھی محسوس اور غیر محسوس طور پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی بھی شاعر اپنی روایت سے منقطع ہو کر ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔ ہر اہم اور غیر اہم شاعر نے کسی نہ کسی طور پر روایت سے ایک رشتہ ضرور قائم کیا ہے۔ نظامِ تلمیحات، نظامِ استعارات اور نظامِ علائم کے سرچشمے، مشرقی شعری روایت ہی میں ملتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی ہیئتیں نامانوس ہیں۔ روایتی شاعری کا وہ حصّہ جو شاعر کے تجربے کا عکس پیش کرتا ہے یا جس میں شاعری کی اپنی انفرادیت نظر آتی ہے، ہر دور اسی میں اپنا عکس بھی دیکھتا ہے اور اسے قبولیت سے سرفراز بھی کرتا ہے اور یہی حصّہ حقیقتاً ہمارے لیے عصری معنویت کا حامل بھی ہے۔

عموماً جو شعراء غزل کی کلاسیکی روایات سے آگاہ نہیں ہوتے انہیں ضبطِ اظہار کی توفیق بھی نہیں ہوتی لیکن احمد سوز نہ صرف اپنے لسانی برتاؤ کے اعتبار سے بلکہ فکر و خیال کے اعتبار سے بھی اور الفاظ کی تعبیرات کے اعتبار سے بھی پوری طرح غزل کی روایات سے باخبر ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں نئے استعارے بھی خلق کرتے ہیں اور پرانے استعاروں کو بھی استعمال کرتے ہیں جس سے غزل کے ادب و آداب کا چہرہ مجروح نہیں ہوتا۔ انہوں نے ان آداب کا اپنی غزلوں میں جس طرح لحاظ رکھا ہے وہ اثر آفرین بھی ہے اور خوش سماعت بھی۔ یہ چند اشعار اس کے نمونے ہیں:۔

چور ہوتا تجھے چوری کرتا
میں تجھے اپنی تجوری کرتا

آ گہی صوتِ ناشنیدہ سی
ایک تصویر، سر بریدہ سی

سخت مشکل ہے مطمئن رہنا

ہے صفت سب میں اک دریدہ سی
وہ ابھی معصوم ہے، شفاف ہے
دودھ کچّا ہے، ابلنا چاہتا ہے
یا زندگی کو جینے کا مجھ میں ہنر نہ تھا
یا میرا ہی ضمیر مجھے معتبر نہ تھا
ذرا سی مسافت ، بہت سا عذاب
بدن کے سفر کا ہے رستہ خراب
محبتوں میں، محبت بہت ضروری ہے
جو توڑ لیتے ہیں رشتہ، انہیں منانا کیا
دکھائی دینے لگی ہے دراڑ رشتوں میں
ہے ہم میں دوستو! کوئی منافقانہ کیا

احمد سوز کے شعری مجموعہ 'ناشنیدہ' کی پہلی قرأت سے یہی تأثر ابھرتا ہے کہ ان کے یہاں یادوں کے سہارے ازسرِ نو زندگی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی غزلوں میں جستجو در جستجو کا نامتناہی سلسلہ موجود ہے۔ وہ زندگی کے نامناسب رویے پر شکوہ بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے قربان ہوجانے کی آرزو بھی رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا لہجہ بہت متوازن ہے۔ یہ وہ سنبھلا ہوا انداز ہے جس سے شاعری کو تقویت ملتی ہے۔ ان کی غزلوں پر یہ گمان نہیں گزرتا کہ یہ محض آڑی ترچھی لکیروں کی صورت گری ہیں اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معنی سے بے نیاز ہیں بلکہ ان کی غزلوں کی فضا مانوس بھی ہے اور پُر اسرار بھی کیوں کہ اس فضا بندی کا خمیر کلاسیکی اور جدید اسلوب کے امتزاج سے اٹھا ہے اور یہی ایک سچّے شاعر کی پہچان ہے۔

☆☆☆